''ساحرِ فسوں ساز اور افعیِ جاں گداز''
یعنی زبانِ گویا کے پارکھ شمس العلما الطاف حسین حالی

ڈاکٹر سعادت سعید

Abstract:

Hali`s preface to his poetic collection entitled `` Muqadima sher o shaeri`` falls in the category of theoretical criticism. In their own age three remarkable English Romantic poets Wordsworth, Coleridge and Shelly also wrote prefaces in the process of defending their poetic visions. Their thoughtful investigation of poetry and poetic norms guided English criticism up till the introduction of New Criticism in Twentieth century. Critics belong to Urdu language and literature flip through the pages of preface by Khawaja Altaf Hussain Hali as serious readers. They appreciate fully the heights of its pensive level. The writer of this article seems to be convinced that Altaf Hussain Hali works wonder as a writer of his own merit. In his specially evolved effective style Hali hankered after simple prose, artistic approach and ethical convictions successfully.

بتیس دانتوں کے درمیان مزے لوٹنے والی زبان گویا کو مولانا الطاف حسین حالی نے استعارے کے پیرائیے میں ساحرِ فسوں ساز اور افعیِ جاں گداز سے تعبیر کیا ہے۔ جب بولے ہوئے لفظ یعنی روزمرہ بول چال کی زبان شاعری یا انشا پردازی کی صورت سامنے آتی ہے تو اس میں پیدا ہونے والا جادوئی رنگ یا تلخی بیان کی پگھلا دینے والی کیفیت دونوں ہی شاعروں اور ادیبوں کی قدرت بیان کے پرتو سمجھے جاتے ہیں۔ مناظر، وقوعات، افکار، جذبات کی بیانیاتی عکس بندی کارطفلاں نہیں۔ شعر و ادب میں سادگی و پرکاری کی کیفیتیں پیدا کرنے والے شاعروں

کی جگر کاویوں کی داد نہ دینا بلکہ الٹا ان پر سنگ باری کرنا نقادوں کی بے حسی اور کم نظری کا کھلا ثبوت ہے۔حالی کے شعر و ادب کی اخلاقی نہجوں سے بھی نقادوں کے کھل کھیلتے جذبات واحساسات و خیالات کو پسند کرنے والے ایک ٹولے کو خدا واسطے کا بیر ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے جس نوع کی سادہ نثر لکھی اور سہل ممتنع کی شاعری کی ان کے اعماق کو دیکھنے کی بجائے انہیں نظر انداز کرنے والے نقادوں اور مبصروں کے شعور سے گریز ہی میں قارئین کی بھلائی ہے۔حالی کی سادہ زبان کے بطن میں موجود علمی وتہذیبی وسعتیں تا حال ہمارے نقادوں کی تحریروں میں ''سانپ لہریں'' بنانے کا کام کر رہی ہیں۔ حالی کی نیندیں اچاٹ دینے والی کہانیوں سے جو سرگرانیاں پیدا ہوتی ہیں اس سے ہمارے ادب برائے ادب اور ادبی جمالیات محض کے رسیا نقاد پریشان کیوں نہ ہوں کہ انہوں ان کے پسندیدہ ادب میں موجود علم بیان و بدیع کی مدد سے بنائے ہوئے فنی تاج محلوں کو اس بنا پر پرِ کاہ کی وقعت نہیں دی کہ ایسے بیانیوں میں معانی یا فکر کا ست یا جوہر موجود نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے میں:

> حالی کا **مقدمہ شعر و شاعری**، اردو میں نئی تنقید کی اولین باضابطہ کتاب الاصول سمجھی جاتی ہے(اگرچہ ان کے تنقیدی خیالات ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں میں بھی بکھرے ہوئے ملتے ہیں)۔ان کے تصورات کی فہرست یوں بن سکتی ہے:ا۔شعر کی ماہیت اس کا منصب اور اس کے ضروری اوصاف۲۔شاعری کا تعلق اجتماعی زندگی سے اور اس کی افادیت۳۔شاعری کا تعلق قومی تاریخ وتہذیب سے!۴۔اردو شعری اصناف کا تجزیہ، ان کی خامیاں اور ان کی اصلاح ۵۔اسلوب بیان زبان اور پیرایہ ہائے اظہار کی صورتیں اور زبان اور لفظیات کی اہمیت ۶۔نثری اصناف (مثلاً سوانح عمری) کے بارے میں حالی کے خیالات۔ (۱)

مولانا الطاف حسین حالی کی تعمیمی بصیرت نے اردو شاعری کا ناتا اس انسانی فکر سے جوڑا جس کا مقصد اول جانورستان میں انسان کی تلاش ہے ۔یعنی پست المخلوقات کے جبلی حوالوں کی تہذیب سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے اشرف المخلوقات کی تلاش کرنا۔ یعنی یہ کام اتنا آسان نہیں ہے کہ پھرتا ہے فلک برسوں تب کہیں جا کر خاک کے پردے سے کوئی انسان نکلتا ہے۔قطرے کا گہر بننا ایسا آسان بھی نہیں ہے اس کے لیے اسے ہر موج کے دام میں موجود'' حلقہ صد کام نہنگ'' سے متحارب ہونا ہوتا ہے۔اگر آپ کسی شاعر سے اس کی شاعری کے بارے میں استفسار کریں تو عمومی طور پر اس کو جواب میں یہ کہتے سنیں گے کہ ''میں تو اپنے ضمیر کے مطابق شعر لکھتا ہوں۔'' یہ اور بات ہے کہ شعر لکھتے ہوئے وہ کئی مرحلوں پر بھول چوک کا بھی شکار ہوسکتا ہے ۔تو ایسے میں یہ آسانی ابتذال کی درکشائی ہوسکتی ہے۔یعنی دل میں کسی کے شرم و حیا نہیں رہتی کہ نظیر اکبر آبادی کو تلخ ترین طعنہ بازی کرنی پڑتی ہے یعنی ایسے لوگوں سے یہ بھی کہنا نہیں پڑتا کہ'' کھول دو'' ۔منٹو کے اس افسانے کا لب لباب یہ تھا کہ انسان بے شرمی کی آخری منزلوں پر پہنچ چکا ہے اس کو اب کسی کندی گالی ہی سے یاد کیا جا سکتا ہے یعنی'' وہ ۔۔۔عجیب جانور ہے'' فل فلوٹیوں کے چکر میں رہتا ہے۔

تب الطاف حسین حالی کہ بقول محمد حسن عسکری ''ایک بھلا مانس غزل گو'' مفلر اور رومال کا رسیا ''حرامجادی'' کو بھی ماں بہن بیٹی سمجھ بیٹھا ہے۔انھیں یہ آواز اچانک کہیں سے آتی سنائی دی ''اے ماؤں بہنو، بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے'' فرانسیسیائے شعور کے لیے یہ بات تازیانے سے کم نہ تھی۔وہ تو کھلے بندوں طلسم ہوشربا کی لٹکتی مٹکتی دوشیزاؤں، میر اثر کی مثنوی ''خواب و خیال'' کے کھل کھلواڑ کی تحسین پر فخریہ داد وصول کیا کرتے تھے یعنی بقول غالب'' تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ'' سود و زیاں کا کیا مذکور۔علاوہ ازیں نواب مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق کی رال ٹپکاتی حسیت کے بھی ان جیسے کئی رسیا من بسیا ہو چکے تھے اور قلندر بخش جرأت کی قلندرانہ بیبا کیوں سے مزے لینے کو جزو ایمان و ایقان سمجھتے تھے۔اس نوع کی مشرقیت کے مقابلے میں مولانا الطاف حسین کی پیروی مغربی ان کے لیے سوہان روح بن گئی تھی۔اور پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انہیں شرم کا مفلر منہ پر ڈالے انتہائی بھلا مانسی سے کعبے جانا پڑا اور یوں جبلی حسیت کے مارے شاعروں ادیبوں کو بھی مغربی گمراہیوں کی دلدل میں دھنسا پانا ان کی دور رس نگہ کا سرمہ ٹھہرا۔ انہوں نے پھر جس روحانی سرور کی جانب سفر آغاز کیا اس میں ان کا کل ساز و سامان طہارتی آفتابہ ٹھہرا ۔ایسے میں انہیں یہ ضرور خیال آیا ہوگا کہ کاش وہ عہد جوانی میں بھی حالی فیم مفلری بھلا مانسی اختیار کر لیتے۔یعنی ''در جوانی توبہ کردن شیوہ پیغمبریست!''میر کا یہ مصرعہ بھی ان کے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوگا ''سونے کا سماں آیا تو بیدار ہوا میں'' !

اس طویل گوشمالی تشبیب کے بعد کہ یہ روایت بھی حسن عسکری اور ان کے شاگردوں کی پیروی کرتے کرتے ہم تک پہنچی ہے گریز یوں کیا جا سکتا ہے کہ حالی کی مسدس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جس حوصلے کی خبر دی اس نے آگے چل کر علامہ اقبال سے شکوہ اور جواب شکوہ لکھوایا۔اس کی انتہا ان کی مثنوی '' پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' میں نظر آئی۔مغربی شعور کو مشرقی بھلا مانسی سے جو خطرہ تھا وہ علامہ اقبال کے نظریہ شعر کا جوہر بن کر سامنے آیا۔اس جوہر کی آئینہ بندی کے ابتدائی آثار **دیوان حالی** میں اور انتہائی نتائج **مقدمہ شعر و شاعری** میں اس انداز سے سامنے آئے کہ جدید ترین ادبی تھیوریز کے کشتے بھی اپنی تنقید میں حالی کی تنقیدی بصیرت سے دامن نہیں بچا پائے۔کلونیل ، مابعد کلونیل نفسیات، فلسفے، عمرانیات، بشریات ، اسطوریات ، نو تاریخیت اور تانیثیت کے قصیدہ گو بھی اسطوریات زدہ یونانی تنقید میں موجود میوزز (شاعری کی دیویوں) کی شاعروں کے ساتھ آنکھ مچولی کو مجذوب کی بڑ قرار دے رہے ہیں۔ان کا سائنٹفک شعور اس قسم کے ماورائی خیالات کو ماننے سے بالیقین گریزاں ہے۔حالی کے استاد گرامی نے شاعری اور غیب کے تعلق پر حقیقت پسندانہ انداز سے روشنی ڈالی اور اپنے ''صریر خامہ'' کو نوائے سروش کہہ کر شاعری کی دیویوں کے منہ لگنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھا۔اور کھل کر کہہ دیا کہ شاعری میں آمد فی الاصل وہ آورد ہے کہ جو ان خیالات پر مشتمل ہے کہ جو شاعر کے ذہن میں جمع ہوتے رہتے ہیں اور پھر ایک دن جب ذہن کے یہ نالے کسی رکاوٹ کی زد میں آتے ہیں اور راہ نہیں پاتے تو وہ کناروں سے باہر سیلابی ریلے بن جاتے ہیں اور یوں ان کی طبع کی روانی قابل دید ہوتی ہے۔سو مولانا الطاف حسین حالی نے حق شاگردی ادا کیا اور کیا کہ شاعری شعور سے عبارت ہے اور شاعر اپنے شعروں کو اور شعری مجموعوں کو صاف کرنے کے لیے بڑے پاپڑ

بیلتا ہے یعنی وہ ریچھنی کی طرح سے اپنے بچے کو چاٹ چاٹ کر مصفا کرتا ہے اور راتوں کو جب پرندے اور مچھلیاں سوئے ہوتے ہیں وہ بیدار ہو کر اپنے شعروں کے لفظوں کو پاک کر کے اس سطح پر لے جاتا ہے کہ وہ آمد کی سطح پر پہنچ جاتے ہیں۔

حالی نے شاعری کے ملکہ کو موثر سمجھا ہے۔ان کے خیال میں پولیٹیکل معاملات میں شاعری نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔شاعری سوسائٹی کے تابع ہوتی ہے،سوسائٹی کو مفید شاعری کی ضرورت پڑتی ہے

> سویلزیشن کا اثر شعر پر برابر ہوتا ہے جس قدر کہ علم زیادہ محقق ہوتا جاتا ہے اسی قدر تخیل جس پر شاعری کی بنیاد ہے گھٹتا جاتا ہے، جب شائستگی زیادہ پھیلتی ہے تو یہ چشمے بند ہوجاتے ہیں۔ (۲)

شائستگی کے زمانے میں

> ذہن نئی تشبیہیں اختراع کرنے سے عاجز نہیں ہوا (۳)

> شعر اگر چہ براہ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اس کو اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔ (۴)

شاعری کی افادیت کے حوالے سے حالی کا نقطہ نظر بڑا واضح تھا کہ شعر اندر ہی اندر شاعری کے قارئین پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے اور یوں اس کے اخلاق پر گہرے اثرات بھی مرتب کرتا ہے۔حالی کہتے ہیں کہ تخیل

> ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربے یا، مشاہدے کے ذریعے سے ذہن میں پہلے مہیا ہوتا ہے۔ یہ اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اسے الفاظ کے ایسے دلکش پیرائے میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے۔ (۵)

یہاں شاعری کے حوالے سے میرے والد بزرگوار ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کی رائے ملاحظہ فرمائیں کہ جنہوں نے اپنے پورے تحقیقی اور تخلیقی کام میں الطاف حسین حالی کے معتقد کے بطور صائب شعور اور انسان دوست ادب کی جا بجا باتیں کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> حالی نے **مقدمہ شعر و شاعری** لکھ کر کسی حد تک شعر کی معنوی شرائط ،داخلی خوبیوں اور مقصدیت و افادیت کے پہلوؤں پر ضرور زور دیا ہے لیکن عام طور پر قدیم و جدید زمانہ میں شاعروں نے اس نقطہ نظر سے شعر پر بحث نہیں کی۔ البتہ عالموں اور صوفیوں یا عالم اور صوفی شاعروں میں سے بعض نے اس بحث کو ضرور چھیڑا ہے۔ (۶)

ڈاکٹر صاحب نے اس حوالے سے شاعری کی نظری روایت کے حوالے سے چند پتے کی باتیں کی ہیں۔ان کا یہ کہنا ہے:

> مسلمان شاعروں میں ایک خاص طرز فکر رکھنے والوں نے ہر زبان کی شاعری میں اس نظریے کا علم بلند رکھا ہے ۔ اس دائرے میں مذہب ، تصوف اور اخلاق پر کام کرنے والے جملہ شاعروں کے نام لیے جا سکتے ہیں اور جہاں کہیں کسی بزرگ نے مذاق زمانہ کے مطابق عام

طرز کی شاعری میں دلچسپی لی ہے تذکرہ نگاروں نے ''شاعری دوں مرتبہ اوست'' کا فتوی لگایا ہے۔ اردو کے قدیم شاعروں میں سے خواجہ میر درد نے اور جدید شعرا میں سے علامہ اقبال نے خاص طور پر شاعری کے اسلامی رخ پر زور دیا ہے۔ میر درد نے اس قسم کی شاعری کو نتیجہ آدمیت اور فضیلت انسانیت کہا ہے۔ اپنے اس نقطہ نظر کی انہوں اپنی تصانیف علم الکتاب، نالہ درد، شمع محفل، درد دل وغیرہ میں کئی جگہ تشریح کی ہے۔(۷)

نئے زمانے میں علامہ اقبال نے اپنی شاعری اور نثر میں شاعری کے تناظر میں جس نظریہ سازی کا کام کیا ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے:

اقبال نے بانگ درا کی نظم ''سید کی لوح تربت'' میں اسی قسم کی بات کی ہے۔ اور شاعر کو تلمیذ رحمٰن کہہ کر اسے اس کی ذمہ داری کا احساس دلایا ہے۔(۸)

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامہ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جام جم
پاک رکھ اپنی زباں تلمیذ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمن باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

(سید کی لوح تربت۔ بانگ درا)

اسی طرح ایک دوسری نظم بہ عنوان شاعر میں کہتے ہیں:

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم
منزل صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفل نظم حکومت ، چہرۂ زیبائے قوم
شاعر رنگیں نوا ہے دیدہ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

(نظم شاعر۔ بانگ درا)

ڈاکٹر صاحب کا یہ بھی کہنا ہے:

شعر کا یہ نظریہ درد سے اقبال تک اگر اردو کے ہر شاعر کا نظریہ ہوتا تو آج اردو شاعری کی حیثیت بالکل مختلف ہوتی اور اس پر گل و بلبل کا جو لیبل لگایا جاتا ہے اور اس کے ایک بڑے حصے کو افادیت سے خالی ہونے کا جو الزام دیا جاتا ہے وہ شاید ختم ہو جاتا۔ اس کا یہ مطلب بھی

نہیں کہ دوسرے اردو شاعروں نے کبھی شعر کی ماہیت کے متعلق سوچا ہی نہیں ۔ میر و سودا کے زمانے سے لے کر آج تک کئی شاعر اس پر اظہار خیال کر چکے ہیں لیکن ان کی سوچ زیادہ تر اس کے فنی پہلو سے متعلق رہی ہے ۔ مقصدیت اور افادیت کے منشاء الٰہی پر بات کرنے والے نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ اس سلسلے میں میر تقی میر کی مثنوی ''تنبیہ الجہال''، مرزا رفیع سودا کا رسالہ **سبیل ہدایت**، قدیم و جدید شاعروں کے تذکروں میں شعراء کے کلام پر آرا، شاعروں کے منظوم معرکے، متاخرین میں مرزا داغ کا ''قصیدہ بطور ہدایت نامہ'' دیکھئے جس میں شعر گوئی کی شرائط کو نصیحت کی طرز پر بیان کیا گیا ہے۔ ان سب میں شعر کے فنی خصوصاً خارجی پہلو یعنی روزمرہ، محاورہ، قافیہ، ردیف، عروض، تشبیہ، استعارہ اور صنعتوں وغیرہ کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے ۔ ابوعبدالعزیز معروف بہ سید منظور احمد کی تصنیف ''عقدالجواہر مسمی بہ موید الشعرا'' میں شرعی لحاظ سے شاعری کے جواز و عدم جواز پر بحث کی گئی ہے ۔ خواجہ میر درد نے اپنی ایک رباعی میں شعر و شرع میں ربط پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں

ہر چند کہ در زہد شوی لاثانی
یا در رہ علم و فضل مرکب رانی
سوئے شعرا بہ چشم تحقیر مبیں
گران من الشعر وا لحکمت خوانی

سوچ کا یہ انداز جب بھی کسی اردو شاعر کے ذہن میں ابھرا ہے اس نے مذہبی شاعری کی طرف (جس میں تصوف، اخلاق وغیرہ بھی شامل ہے) توجہ کی ہے ۔ اس طرز کی شاعری کی طرف توجہ کا ایک سبب خیر و برکت کی طلب بھی رہی ہے۔ حمد، نعت، منقبت، اور مناجات کا بہت سا سرمایہ اور مرثیے اور سلام کا بہت سا حصہ اسی طلب کا مرہون منت ہے۔ (۹)

حالی کا **مقدمہ شعر و شاعری** شاعروں کو جس نوع کی رہنمائی مہیا کرتا ہے وہ انسانی معاشروں میں انسانوں کو کیسے رہنا چاہیئے اور شاعروں کو زٹلیات اور عبید زاکانیات سے کیسے بچنا چاہیئے وغیرہ کے حوالے سے مفید مطلب سلاسل پر منحصر ہے۔ ڈاکٹر الف ۔ د۔ نسیم ڈاکٹر سید عبداللہ کے قریبی شاگردوں میں سے ایک تھے۔ وہ اورئنٹل کالج میں اردو کے پہلے ریسرچ سکالر اور گولڈ میڈلسٹ بھی تھے۔ انہوں نے قیام پاکستان کے مقاصد کو سامنے رکھ کر ایسا تحقیقی اور تنقیدی ادب تخلیق کیا ہے کہ جو جانورستان میں انسان تلاشی کی رومی روایت سے اکتساب فیض پر مبنی ہے۔ اس روایت کا سرنامہ علامہ اقبال کی مثنوی ''اسرار خودی'' کے اسراروں بھرے معنوی قفلوں کی کلید ہے یعنی (۱۰)

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

(کل شیخ چراغ لے کر شہر میں گھوم رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا

کہ میں وحشی درندوں سے ملول ہوں مجھے انسان کی تمنا ہے)

زیں همرہان سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

(ان سست عناصر ہمراہیوں نے میرا دل دکھایا ہے
مجھے شیر خدا اور دستاں سے تعلق رکھنے والے رستم کی تمنا ہے)

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

(میں نے کہا کہ ہم نے اس کی بہت تلاش کی کہ جو دستیاب نہیں ہے
اس نے کہا کہ جو دستیاب نہیں ہے مجھے اس کی تمنا ہے)

(مولانا جلال الدین رومی) ترجمہ

ڈاکٹر سید عبداللہ نے آزاد نظم کے حوالے سے مضمون لکھتے ہوئے شاعری کے بارے میں مولانا الطاف حسین حالی کی رائے سے ہی استنباط کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اردو شاعری میں مولانا حالی نے نیچرل طرز بیاں کے اصول مرتبہ کر کے وضاحت اور سادگی کو مرکزی اہمیت دی، ان کا طرز بیاں دو بڑی بنیادوں پر قائم تھا (۱) بے ساختگی (۲) وضاحت۔ سادگی کو بے ساختگی کے لئے لازمی ٹھہرایا اور قطعیت، وضاحت کے ہم رکاب آئی۔ یہ کلاسیکیت کے لکھنوی انداز تکلف کے خلاف احتجاج تھا مگر اس کا ایک نتیجہ شاعری میں لہجے کی درشتی، کھرد راپن اور بے نمکی تھا۔ اقبال نے وضاحت کے نصب العین کو اپناتے ہوئے اس کو شعریت سے ہم رشتہ کیا۔ اس کے بعد حقیقت نگاری نے اظہار میں وضاحت کے ساتھ قطعیت پر پھر زور دیا مگر اس کا شدید ردعمل ابہام اور اہمال کی صورت میں ہوا۔ یہ ابہام کچھ تو تصورات کے راستے سے آیا اور کچھ علامتوں کے مبہم اور مخفی سلسلوں کے توسط سے پیدا ہوا۔ پھر جدید شاعری کی اب یہ حد ہے کہ وضاحت کو شاعری کی ضد سمجھا جا رہا ہے۔ جدید شاعری کا جھگڑا تو دیر سے چل رہا ہے اور اس کے رخ بھی بہت سے ہیں۔ مگر تازہ ترین جھگڑا علامت نگاری کے ایک خاص اسلوب نے اٹھایا ہے۔ پہلے یہ دیکھنا ہے کہ علامت نگاری کیا ہے؟ پھر یہ سوچنا ہے کہ علامت نگاری کے خلاف شکایت کیا ہے؟ اور آخر میں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ علامت نگاری کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے؟ اور یہ بھی کہ اس کا ادبی مستقبل کیا ہے؟ علامت نگاری کوئی نئی چیز نہیں، شاعری میں بلکہ اظہار کی ہر روایت میں علامت از ابتدا وسیلہ اظہار و ابلاغ چلی آئی ہے۔ یہ بھی اظہار کا ایک اسلوب اور جائز اسلوب ہے۔ مگر اس کی کامیابی کا انحصار، شاعر کی قدرت، موزوں استعمالی اور موقعہ و ماحول پر منحصر ہے۔ علامت مخفی تصورات کے وسیع نظام کی

مجمل ترین شکل ہے۔ (۱۱)

مولانا حالی نے وضاحت اور فطری اسلوب بیاں کے ہمراہ، زندگی کی عام مادی مہمات کے موضوعات کو شاعری کا مقصد بنایا تھا۔ ترقی پسند تحریک اور بھی آگے بڑھی۔ اس میں خارجی حقیقت کہ وہ ہے بلا کم و کاست) کو طریق کار بنایا۔ منطق اور عقل نے حقیقت نگاری کے اس انداز کو جہاں عقلی شان بخشی وہاں اس نے شاعری (اور ادب کی دوسری شاخوں کو) بے مزہ اور خشک بھی بنایا۔ شاعری سے وہ کیفیت غائب ہوگی گئی جو پراسرار طلسمی دنیا کے انکشافات کی صورت میں ہر بامزہ شاعری میں ہوا کرتی ہے۔ اردو میں علامت نگاری دراصل اسی سنجیدگی، خشکی اور خارجیت کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ (۱۲)

یہ تو طے ہے کہ شاعری میں سنجیدگی اگر نہ ہوتو قارئین تفنن طبع کو شعر کا وظیفہ قرار دے دیتے ہیں۔ زوال پذیر قوموں کو سپرد خاک ہونے سے بچانے کے لیے جن خشک خیالات کی ضرورت ہوتی ہے ان سے مفر بھی ممکن نہیں۔ اور جہاں تک خارجیت کا تعلق ہے شاعر صورت حال کی آگہی بھی رکھتے ہیں اور وہ براہ راست اظہار بھی کر سکتے ہیں اور شمع و پروانہ کی پرانی علامتوں کو نئی خارجیت کے بیان کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے اقبال کی خارجی اور معروضی شاعری خصوصی طور پر قابل توجہ ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے جانا چاہتے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے کسی ایک جگہ بھی بے مقصد شاعری کی حمایت نہیں کی۔ انہوں نے صنف غزل کی اصلاح کے بیان میں غزل میں برتی جانے والی علامتوں کے پس منظر میں تعمیمی علامتوں کے استعمال کا مطالبہ کیا۔ تعمیمی علامتوں میں داخلیت اور خارجیت ایک کٹھالی میں پگھل کر شعری معنویت کی توسیع کا باعث بنتی ہیں۔ مثلاً ان کا کہنا تھا کہ غزل میں ایسے الفاظ نہ لائے جائیں کہ جن سے محبوب کے مذکر یا مونث ہونے کا عندیہ ملے۔ اس کے برعکس محبت کا عمومی تصور قلمبند کیا جا سکتا ہے کہ جس سے قاری محبوب کے ساتھ ساتھ اس جذبے کو وطن، مادر وطن، ماں، خواہر، برادر، دوست ، انسان ، خدا اور فطرت کے حوالے سے بھی محسوس کر سکے۔ عمومی اور تخصیصی علامتوں کا فرق عمومیت میں ڈوبی قدیم اور جدید دور کی غزلیہ علامتوں اور انفرادی تخصیصی نظمیہ علامتوں کو باہمی طور پر جدا کر سکتا ہے۔

اس تناظر میں مبالغہ اور جھوٹ پر مبنی شاعری کے خلاف حالی نے کھل کر نظریہ سازی کی اور ''سقنقور کی گردن'' یا ''تابوت میں انگلی'' یا اس نوع کی قوافی و ردائف پر مشتمل سینکڑوں غزلوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی لیکن یادگار غالب میں وہ غالب کی صانعی کے زیر اثر لکھی جانے والی غزلوں کے پیچیدہ اشعار کی معروضی شرحیں بھی کر گزرے۔ انہیں غالب کے علامتی شعری اسلوب سے غایت درجہ محبت اور دلچسپی تھی۔ نیچرل شاعری کے سلسلے میں مولانا الطاف حسین حالی کے یہ اقتباس ملاحظہ ہوں:

نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔ لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی

ترکیب و بندش تابمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہو.....(غالب اس سے مستثنیٰ ٹھہرتے ہیں)(۱۳)

نیچرل کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں۔(۱۴)

اس حوالے سے بھی حالی عمومی انسانی فطرت اور موجود سماجی اطوار کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔مسلمانوں کے عہدِ زوال میں جھوٹ اور اغلاق سے پرہیز کرنے کا جو نسخہ حالی نے بتایا وہ تیر بہدف ثابت ہوا اور بہت جلد برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے اپنی نئی منزلوں کی جانب سفر شروع کر دیا۔

الطاف حسین حالی نے قصیدہ نگاری میں جس نوع کی مبالغہ آرائی دیکھی اس کے خلاف ردِعمل کے طور پر لکھا۔

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر

یہی نہیں انہوں نے مقدمہ شعر و شاعری میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان کے خیال میں مطلق العنان اور خودمختار بادشاہوں کی شاعروں پر عنایات اور بخشیش انہیں دریوزہ گر بنا دیتی ہیں۔شاعر کی طبعی آزادی کا جوہر مسلسل اور متواتر مداحی کے بسبب زائل ہو جاتا ہے وہ بھٹئی، جھوٹ اور خوشامد کا راستہ اختیار کرتا ہے۔حالی لکھتے ہیں۔

جب واقعات نبڑ جاتے ہیں اور مدح سرائی کی کر ہمیشہ کے لئے شاعر کے ذمہ لگ جاتی ہے تو اس کی شاعری کا مدار صرف جھوٹی تہمتیں باندھنے پر رہ جاتا ہے پھر جب آفتاب اقبال کا دورہ جس کی عمر طبعی شخصی سلطنتوں میں اکثر سو برس سے زیادہ نہیں ہوتی ختم ہونے کو ہوتا ہے اور سلاطین و امرا میں وہ خوبیاں جن کے سبب سے جمہور انام کے شکر و سپاس و مدح وستائش کے مستحق اور شعرا کی مداحی سے مستغنی ہوں باقی نہیں رہتیں تو ان کو شاعروں کی بھٹئی کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں سوجھتی جن کو سن کر ان کا نفس موٹا ہو لہٰذا ان کو شاعروں کی زیادہ قدر کرنی پڑتی ہے۔ اس سے جھوٹی شاعری کو اور زیادہ ترقی ہوتی ہے۔(۱۵)

شعر میں حقایق کے بیان کے لیے بڑے شاعروں نے سادہ، پیچیدہ اور علامتی وتیرے بھی اختیار کیے ہیں۔یہ تینوں سلسلے ہمیں میر و غالب کے ہاں بھی جھلملاتے دکھائی دیتے ہیں۔غزل میں موجود علامتی سلسلے خود حالی کی شاعری میں بھی ہیں۔میر اور غالب کی بنائی ہوئی علامتی غزلیہ زبان سے بچنا نیچرل شاعری والوں کے لیے بھی مشکل تھا۔حالی کا ایک مضمون ''زبان گویا'' بھی ہے کہ جو کتاب ''تزکِ اردو'' مطبوعہ ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا اور جسے شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے کلیات نثر حالی میں شامل کیا ہے اپنے اسلوب اور رنگ میں علامتی چاشنی کا پرتو لیے ہوئے ہے۔اس مضمون کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

اے میری بلبل ہزار داستاں! اے میری طوطی شیوہ بیاں!اے میری قاصد!اے مری ترجمان!اے میری وکیل!اے میری زبان!سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟

کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد اور نہ جادو کا اتار۔کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ (۱۶)

شاعر کی آزادی اظہار کے سیاق وسباق میں حالی اپنے ایک سوانحی نوٹ میں یوں رقمطراز ہیں:

لاہور میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا؛ یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔میں نے بھی اسی زمانے میں چار مثنویاں ایک برسات پر، دوسری امید پر، تیسری انصاف پر اور چوتھی حب وطن پر لکھیں۔ (۱۷)

جس مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا شاعر اس مضمون پر اپنے خیالات کے بیان اور بیانیے میں من مرضی سے کام لے سکتے تھے۔ان کی استعمال شدہ زبان سحر انگیز بھی ہوسکتی تھی اور سپاٹ بھی۔ان مناظموں میں شامل ہونے والے ان شاعروں نے لفظ و معنی کے انتخاب میں آزادی سے کام لیا۔یعنی خود حالی نے ایک مقبوضہ ملک میں رہتے ہوئے حب وطن اور انصاف کی امید بھری باتیں کیں تو ان کو اس زمانے کے پس منظر میں حالی کی داخلی تمناؤں کی نقیب سمجھا جا سکتا ہے۔

فتح محمد ملک اپنے ایک مضمون ''نئی شاعری اور جدید شاعری'' میں لکھتے ہیں:

آج کے اردو شاعر پر ۱۸۵۷ء میں دو مصیبتیں نازل ہوئیں۔ جنگ آزادی میں ہماری شکست اور مشہور فرانسیسی شاعر چارلس بودیلیئر کے پہلے مجموعہ کلام ''بدی کے پھول'' کی اشاعت، جنگ آزادی میں ناکامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز ہمیں مہذب بنانے میں ہمہ تن مصروف ہوگیا۔سرسید احمد خاں اور ان کے ساتھ کی آنکھیں اس تہذیب کی روشنیوں سے چندھیا گئیں اور پوری دردمندی کے ساتھ اس شکست کو ماتم کی بجائے جشن کا رنگ دینے میں مشغول ہو گئے۔ بودیلیئر چلاتا رہا۔''فرانس ابتذال کے دور سے گذر رہا ہے۔ پیرس بین الاقوامی حماقت کا سرچشمہ ہے۔'' (دیباچہ۔ بدی کے پھول) مگر سرسید احمد خاں، اور ان کے ساتھی کہ جشن کے ہنگاموں میں مصروف تھے اس آواز کو نہ سن سکے اور نہ جان سکے کہ انگریز جس تہذیب کا تحفہ لائے ہیں یورپ میں اس کا زوال شروع ہو چکا ہے۔کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جس زمانے میں مولانا حالی اردو شاعروں کو ایسی شاعری کرنے کی تلقین فرما رہے تھے، جو ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لئے بھی مفید ہو، اسی زمانے میں چارلس بودیلیر اپنا مجموعہ کلام پبلشر کو سونپتے ہوئے کہہ رہا تھا ''یہ کتاب بیویوں، بیٹیوں اور بہنوں کے لئے ہرگز نہیں ہے'' (دیباچہ۔ بدی کے

پھول) مولانا حالی اور چارلس بودیلیر کے انداز فکر کے اس حیرت انگیز تضاد ہی سے آج کے شاعر کا المیہ شروع ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ سرسید کے زیر اثر مولانا حالی نے شاعری میں اصلاح کی جو تحریک شروع کی تھی وہ اولا ایک سیاسی تحریک تھی شاعری سے اس کا تعلق ثانوی بلکہ ضمنی تھا۔ شاعری کو خالص سیاسی مقاصد کے حصول کا آلۂ کار بنا کر مولانا حالی نے قوم کی زبوں حالی کو دور نے کا جو کارنامہ سرانجام دیا ہے، میں اس سے انکار کی جرات نہیں رکھتا لیکن مجھے اس سے بھی انکانہیں کہ شاعری کا وقتی سیاست کا چاکر بن جانے سے شاعر کے سر پر ایک تلوار لٹکنے لگی۔ آپ چاہیں تو اس تلوار کو نقاد کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ (۱۸)

اردو شاعر پر ۱۸۵۷ء سے قبل بھی ایک مصیبت نازل ہوئی تھی وہ داستانوں میں موجود جسمانی حسیت کی تھی کہ داستان نگاروں کا خیال تھا کہ ان کے فن پارے کے بہت سے حصے ''بیویوں، بیٹیوں اور بہنوں'' کے لیے نہیں تھے۔لکھنوی شاعری کی دیدہ دلیریاں جب ریختے میں ریختی کو شامل کر چکی تھیں تو بادیلیر کو ان کے سامنے طفل مکتب ہی ٹھہرایا جا سکتا تھا۔مگر ریختی میں موجود مہا بدیوں کے پھول ہندوستانی مسلم تہذیب کے زوال کی داستان کہہ چکے تھے۔ جنگ آزادی میں ہماری شکست ملی بے حسی اور ضمیر و وطن فروشی کے نتیجے میں ہوئی۔انگریزوں نے بندو بست دوامی کے تحت ہندوستان کے اصل شیروں کو کاغذی گیدڑ بھی بننے نہیں دیا۔کیا ناچتی کٹھ پتلیاں اپنے نچانے والے کٹھ پتلئے سے کسی بھی سطح پر جیت سکتی تھیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی ہی میں ہوگا۔

ریختہ کی ریختی اور اس سے قبل فارسی شاعری میں ہزلیات و مطائبات کے سلسلوں کے سامنے فرانسیسی شاعر چارلس بودیلیئر کے پہلے مجموعہ کلام ''بدی کے پھول'' کی کیا حیثیت تھی۔حالی نے اس حوالے سے عبید زاکانی کی ہزلیات کو اس رویے کی علامتی بنیاد بنا کر پیش کیا۔تو کیا انگریز فتح یاب ہو کر مشرقیت اختیار کر لیتا اس نے تو جنگ آزادی میں فتح پا کر ہندوستانیوں کو مہذب بنانے میں مصروف ہونا ہی تھا۔سرسید احمد خاں اس وقت'' اسباب تحریک آزادی ہند'' لکھتے تو ہزارہا ہندوستانیوں کی طرح موت کے گھاٹ اتارے جاتے۔زمانے اور تاریخ کی آنکھیں انگریزی تہذیب کی روشنیوں سے چندھیا رہی تھیں سرسید احمد خان جان بچی سو لاکھوں پائے کے مصداق پوری دردمندی کے ساتھ ملی تعلیم و تربیت کے اسباب مہیا کرنے لگے اور یوں یہ شکست نوے سالوں کے اندر ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ایک علحدہ وطن پر منتج ہوئی۔سرسید نے بھی اسلامیان ہند کے بارے میں چلا چلا کر کہا کہ مسلم ہند زوال کے دور سے گذر رہا ہے۔مسلم ہند بادشاہوں کے تابع رہ کر نا اہلیوں اور جہالتوں کا سرچشمہ بنا ہوا ہے ۔سرسید احمد خاں انگریزوں کی جس تہذیب کا تحفہ مسلمانوں کے لیے روا سمجھا یورپ میں اس کا زوال نہیں عروج قابل دید ہے۔گلوبلائزیشن ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔انسانیت کو بدی کے پھولوں میں دفن کر دیا گیا ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف وغیرہ کے وسیلوں سے آج بھی جاری و ساری ہے ۔اب نیوکلونیل بیانیے کا مہا عالمی دور شروع ہو چکا ہے حالی اگر سرسید کے نظریات کی تائید میں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لئے مفید شاعری لکھ رہے تھے تو وہ اپنی تہذیب کے ارتقا اور ترقی کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔

حالی نے شاعر مغربی تو نہیں مغربی فکر کی پیروی کے بارے میں لکھا کہ

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر ہو چکی

پھر ان کے فکر کا طائر اس خیال پر مائل بہ پرواز ہوا کہ

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

یوں انہوں نے انسانی صورت حال کی تائید میں علم شعر بلند کیا اور دنیا میں انسانیت کی تلاش کا سلسلہ ان کا مرکز نگاہ بن گیا۔ یہ انسان اجتماع کا حصہ ہوتے ہوئے فرد بھی تھا جس کا ملت سے ربط اسے قائم و دائم رکھ سکتا تھا۔ زمانہ یا دریا یا تاریخ کسی کے روکے نہیں رک سکتی ان کے بے رحم اعمال سے اپنی حفاظت فرد کی اپنی ذمہ داری بھی ہے۔ ایسے میں حالی نے لکھا کہ

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

اس شعر کی علامتی توجیہہ ہمیں کئی ایک خون آلود اور آتش خیز تاریخی دریاؤں کی یاد بھی دلا سکتی ہے۔سیل زماں کے تھپیڑوں سے بچنے کے لیے انسان کو خود بھی کچھ بندو بست کرنے ہوتے ہیں۔ یہ دریا تقدیر و تدبیر کی معنوی فضا سے بھی گہرا ربط رکھتا ہے۔آخر میں الطاف حسین حالی کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔ یہ حافظے کے زور پر لکھے ہیں۔ ان میں حالی کے تخیل کی رسائی، طرزِ بیان کی سادگی اور تازہ کاری کی خوبیاں دیدنی ہیں۔

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مری رسوائی کا
سات پردوں میں نہیں ٹھیرتی آنکھ
حوصلہ کیا ہے تماشائی کا
درمیان پائے نظر ہے جب تک
ہم کو دعویٰ نہیں بینائی کا

پھر وہی ہم ہیں کہ ہر عشوے یہ کافر کے ہیں لوٹ
زال دنیا سے ابھی ہو کر خفا بیٹھے تھے ہم
شیخ دنیا کی حقیقت رہ کے دنیا میں کھلی
ورنہ دھوکا دور سے دیکھ اس کو کھا بیٹھے تھے ہم
سعی کا انجام پہلے ہم سے آتا تھا نظر
ہاتھ ساحل ہی پہ بیڑے سے اٹھا بیٹھے تھے ہم

کہے اگر کوئی تم کو، واعظ ! کہ کہتے کچھ اور کرتے ہو کچھ
زمانے کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اس کی پروا نہ کیجیے گا

کمال ہے ضد بے کمالی، نہیں ملاپ ان میں حرف گیرو
جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجیے گا تو آپ بے جانہ کیجیے گا
لگاؤ تم میں نہ لاگ زاہد، نہ درد الفت کی آگ زاہد
پھر اور کیا کیجیے گا آخر جو ترک دنیا نہ کیجیے گا

آرہی ہے چاہ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
کر دیا چپ واقعات دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
کون و مکاں سے ہے دل وحشی کنارہ گیر
اس خانماں‌خراب نے ڈھونڈھا ہے گھر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

یاں بھی ہے کون و مکان سے دل وحشی آزاد
جس کو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں
حالی زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثار کچھ اس مرد مسلماں میں نہیں

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالہ جرس کارواں رہے
حالی کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا
کچھ را ز تھے کہ د ل میں ہمارے نہاں رہے

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگادو آگ کوئی آشیاں میں
نیا ہے لیجیے جب نام اس کا

بہت وسعت ہے میری داستاں میں
بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لو گ باقی ہیں جہاں میں

حواشی و حوالہ جات:

(۱) ڈاکٹر سید عبداللہ، **اشارات تنقید**، مرتبہ، ممتاز منگلوری، لاہور: مکتبہ خیابان ادب، ۱۹٦٦ء، باب حالی
(۲) الطاف حسین حالی، **مقدمہ شعر و شاعری**، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور: مکتبہ جدید،۱۹۵۲ء، ص ۱۰۸
(۳) ایضاً، ص ۱۰۹
(۴) ایضاً، ص ۱۱۰
(۵) ایضاً، ص ۱۳۴
(٦) ڈاکٹر الف ۔د۔نسیم ، **اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر** (مقالہ پی ایچ۔ڈی، قلمی) لاہور: مملوکہ پنجاب یونیورسٹی ، ۱۹۵۸ء، تمہیدی مباحث
(۷) ایضاً
(۸) ایضاً
(۹) ایضاً
(۱۰) علامہ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، اسرار خودی، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۲ء، مثنوی کے آغاز سے پہلے دیئے گئے اشعار رومی (ترجمہ راقم الحروف)
(۱۱) افتخار جالب (مرتب)، **نئی شاعری (ایک تنقیدی مطالعہ)**، مضمون ''آزاد نظم''، ڈاکٹر سید عبداللہ، لاہور: نئی مطبوعات، ۱۹٦٦ء، ص ۳۰۷
(۱۲) ایضاً
(۱۳) الطاف حسین حالی، **مقدمہ شعر و شاعری**، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور: مکتبہ جدید،۱۹۵۲ء
(۱۴) ایضاً
(۱۵) ایضاً
(۱٦) شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، **کلیات نثر حالی**، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹٦۷ء، ص ۴۸٦، ۴۸۷
(۱۷) شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، **کلیات نثرِ حالی**، **خود نوشت 'بیان حالی'**، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹٦۷ء، ص ۳۳۹، ۳۴۰
(۱۸) افتخار جالب (مرتب)، **نئی شاعری**، مضمون ''نئی شاعری اور جدید شاعری''، فتح محمد ملک، ص ۱۰۷